ارض القرآن کا سفر

(جناب محمد عاصم صاحب)

(۴)

ہم نے راؤ صاحب سے مکان کو کھلا چھوڑنے کی وجہ دریافت کی، تو انہوں نے بتایا کہ ہم تو بسا اوقات اسی طرح مکان کھلا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، پھر سارا سارا دن باہر رہتے ہیں اور جب واپس آتے ہیں تو اپنی ہر چیز کو محفوظ پاتے ہیں۔ اسماعیل خاں صاحب نے بتایا کہ میں جب آپ لوگوں کو لینے کے لیے بحرین گیا تھا، تو اپنے مکان کو کوئی تالا لگا کر نہیں گیا تھا اور جب میں تین دن کے بعد واپس آیا، تو میری ہر چیز محفوظ تھی۔ سعودی حکومت میں امن و امان کے بہت سے واقعات تو ہم نے پہلے بھی سنے تھے اور گذشتہ سفر میں خود بھی اس کیفیت کا مشاہدہ کیا تھا، لیکن یہ دو واقعات تو ہمارے لیے حد درجہ حیرت انگیز تھے۔ سوچیے آخر یہ کس چیز کی برکت ہے؟ ہمارے ہاں بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اگر یہاں شرعی نظام قائم ہو گیا تو لوگوں کے ہاتھ کٹنا شروع ہو جائیں گے۔ جی ہاں! چند ہاتھ کٹیں گے، لیکن سارا ملک چین پائے گا۔

بُقیق اگلے دن ۱۲ر نومبر کو ہم لوگ اپنے پروگرام کے مطابق بُقیق گئے، جو خُبر سے مغرب کی طرف تقریباً ۴۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور یہاں آرامکو کو سعودی عرب میں تیل کا سب سے بڑا ذخیرہ

(بقیہ تفہیم القرآن)

موجودہ زمانہ میں وقتاً فوقتاً یہ اطلاعات اخبارات میں آتی رہتی ہیں کہ کشتی نوح کو تلاش کرنے کے لیے مہمات بھیجی جا رہی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بسا اوقات ہوائی جہاز جب کوہستان اراراط پر سے گزرے ہیں تو ایک چوٹی پر انہوں نے ایسی چیز دیکھی ہے جو ایک کشتی سے مشابہ ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، ص ۴۰ - اور ۳۴۲)

ملا ہے۔ یہاں بھی پاکستان کے بہت سے ملازمین رہتے ہیں۔ ۱۰ بجے سے ۱۲½ بجے دوپہر تک یہاں بھی سوالات وجوابات کا سلسلہ جاری رہا۔ حاضرین میں سب ہی طرح کے لوگ تھے۔ ایسے بھی تھے، جو مولانا کی کتابیں پڑھے ہوتے اور ان سے متاثر تھے۔ ایسے بھی تھے جو پرویز صاحب کے لٹریچر سے متاثر تھے اور چند تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے تھے۔ آج کے سوالات پاکستان کے موجودہ حالات میں اسلام کے لیے کام کرنے کے طریقوں، بنیادی جمہوریتوں، تبلیغی جماعت سے مل کر کام کرنے یا نہ کرنے اور اہل کتاب کا ذبیحہ جائز یا ناجائز ہونے کے متعلق تھے۔

پہلے سوال کا جواب مولانا نے یہ دیا کہ پاکستان میں بوقت جو حالات پائے جاتے ہیں اُن میں اگر جماعتیں کام نہ بھی کر سکیں تو افراد تو باقی ہیں، اور اللہ کے دین سے ان کا تعلق بھی باقی ہے، اور اگر انہوں نے اپنے خدا سے اس کے دین کی خدمت کا کوئی عہد وپیمان کیا تھا تو وہ بھی ختم نہیں ہو گیا۔ اس لیے ہر ایسے فرد کو اپنی انفرادی حیثیت میں اپنی صوابدید کے مطابق دین کی وہ خدمت کرنی چاہیے جو وہ کر سکتا ہو۔ اس میں نہ کوئی چیز مانع ہے نہ ہو سکتی ہے۔

تبلیغی جماعت کے ساتھ مل کر کام کرنے کے متعلق فرمایا کہ ہم لوگ اپنی صوابدید کے مطابق دین کا کام کر رہے ہیں اور تبلیغی جماعت والے اپنی صوابدید کے مطابق۔ ہمارے اور ان کے طریق کار میں چونکہ اختلاف ہے اس لیے مل کر کام کرنے کا تو سوال پیدا نہیں ہو سکتا لیکن طریق کار میں اختلاف ہونے سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ ہمارے اور ان کے درمیان تصادم یا مخالفت ہو، اور ہم خواہ مخواہ ایک دوسرے کی مزاحمت کریں اور ایک دوسرے کے کام میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کریں۔ اس کے بجائے اگر ہم اور وہ ایک ہی خدا کے دین کی اخلاص کے ساتھ خدمت کر رہے ہیں تو ہمیں ایک دوسرے کا خیر خواہ ہونا چاہیے اور جس حد تک ہم ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں، یا ایک دوسرے سے مدد لے سکتے ہیں اس میں ہم کو دریغ نہ کرنا چاہیے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم یہ تو نہ ہونا چاہیے کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف بدگمانیاں رکھیں اور انہیں لوگوں میں پھیلاتے پھریں۔ آخر میں مولانا نے حاضرین سے یہ بھی فرمایا کہ آپ لوگ سب کچھ پڑھیے اور ہر ایک کے کام کو دیکھ کر خود فیصلہ کیجیے کہ آپ کا

دل کس طریق کار سے زیادہ مطمئن ہوتا ہے۔ پھر جسے بھی آپ پسند کریں اس کو اختیار کر لیجیے۔

اہل کتاب کے ذبیحہ کے متعلق مولانا نے مختصر طور پر اپنی وہی رائے ظاہر فرمائی، جو اپریل ۱۹۵۹ء کے ترجمان القرآن میں مفصل طور پر شائع ہو چکی ہے[1]۔

۱۲½ بجے سے ۳ بجے تک نماز، کھانے اور آرام کا وقفہ رہا۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ تک پھر سوالات و جوابات کا سلسلہ رہا۔ عصر کی نماز کے بعد ہم لوگ تقبق کے قاضی صاحب کے ہاں گئے دراصل صبح ہی جب ہم تقبق پہنچے تھے، تو قاضی صاحب نے مولانا کو پیغام بھیجا تھا اور انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ مولانا نے ان سے عصر کے بعد آنے کا وعدہ کیا۔ ہم گئے تو ہمارے ساتھ بیس پچیس آدمی اور بھی ہو لیے جس سے قاضی صاحب بہت خوش ہوتے اور انہوں نے قہوہ، پھر چائے اور پھر دوبارہ قہوہ سے ہم سب کی تواضع فرمائی۔ قاضی صاحب یہاں تقبق میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے شعبہ کے انچارج بھی ہیں، اس لیے انہوں نے مولانا کا شکریہ ادا فرمایا کہ ان کے آنے پر یہ پاکستانی نوجوان دین کی باتیں سننے کے لیے جمع ہوتے۔

---

[1] یہ تمام جوابات میں اپنی یاد کے مطابق نقل کر رہا ہوں، کیونکہ اُس وقت مَیں نے انہیں اپنی ڈائری میں اس لیے قلمبند نہیں کیا تھا کہ حاضرین میں سے بعض نے ساری گفتگو میں ٹیپ ریکارڈ کر لی تھیں اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اس کا مکمل ٹیپ ہمیں بھی مہیا کریں گے۔ چنانچہ اس دن کی گفتگو کے اور اس کے بعد ظہران وغیرہ میں مولانا کی جو گفتگوئیں ہوئیں، ان سب کے ریکارڈ لاہور پہنچ چکے ہیں، لیکن مشین نہ ہونے کی وجہ سے اب تک ہم ان گفتگوؤں کو ٹیپ سے سن نہیں سکے ہیں۔ علاوہ ازیں تقبق کی اس مجلس میں بعض دوسرے موضوعات سے متعلق بھی مولانا سے سوالات کیے گئے تھے اور مولانا نے ان کے بھی مفصل جوابات دیئے تھے۔ انہیں بھی میں اسی ٹیپ ریکارڈ کی وجہ سے قلمبند نہیں کر سکا۔ امید ہے جلدی ہی مشین کا انتظام ہو جائے گا اور ہم ان تمام گفتگوؤں کو قلمبند کر سکیں گے۔ اس وقت اگر ضرورت محسوس ہوئی، تو ان ساری گفتگوؤں کو کتابی شکل میں شائع بھی کر دیا جائے گا۔

(م - ع)

مغرب کے بعد ہم اپنی قیام گاہ پر واپس آئے اور عشاء کے بعد ایک عرب نوجوان، جن کا نام یعقوب ہے اور جو خُبر کے مقامی باشندے ہیں، کے ہاں کھانے پر گئے۔ یعقوب ہیں تو نوجوان، لیکن گہرا دینی جذبہ رکھتے ہیں اور اس زمانہ میں دین کے تقاضوں اور اس کے لیے کام کرنے کی ضرورت سے خوب واقف ہیں۔ وہ بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں۔ بیروت کے قیام کے زمانہ میں وہ حسن بنا شہید اور مولانا مودودی کی کتابوں سے متاثر ہوئے۔ اس لیے نہ صرف یہ کہ امریکن یونیورسٹی کا ماحول انہیں لگاڑ نہ سکا، بلکہ اس زمانہ میں انہوں نے بہت سے دوسرے نوجوانوں کو بھی اس ماحول کا اثر قبول کرنے سے بچا لیا۔ جب ہم ان کے ہاں پہنچے تو وہاں ان ہی کی طرح کے آٹھ دس نوجوان موجود تھے جن میں بعض مقامی تھے اور بعض شام، فلسطین اور مصر کے رہنے والے۔ وہیں ہماری ملاقات استاذ عبدالحکیم عابدین سے بھی ہوئی، جو اتفاق سے دو روز پیشتر ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں جدہ سے خُبر آئے ہوئے تھے۔ ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور ان کی زبانی مصر و شام کے بہت سے حالات معلوم ہوئے۔ استاذ عبدالحکیم عابدین، حسن بنا شہیدؒ کے بہنوئی اور اخوان المسلمون (مصر) کے جنرل سکرٹری تھے۔ یہ اخوان کے ان چار آدمیوں میں سے ایک ہیں، جنہیں ۵۳ء میں مصری حکومت نے مصری قومیت سے محروم کیا تھا (اور قومیت سے محروم بھی صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ پہلے ہی ملک سے باہر تھے، ورنہ اگر وہ اندر ہوتے تو ان کا انجام بھی وہی ہوتا جو عبدالقادر عودہ شہیدؒ اور ان کے دوسرے ساتھیوں کا ہوا)۔ اب انہوں نے سعودی شہریت اختیار کر لی ہے۔ ان کے بچے جدہ میں رہتے ہیں اور یہ خود جدہ اور بیروت میں وکالت کرتے ہیں۔

کھانا کھایا اور اس کے بعد کافی دیر تک ان لوگوں سے گفتگو ہوتی رہی، جس سے ہمیں بھی اور انہیں بھی ایک دوسرے کے حالات سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔

ظہران | ۱۳ر نومبر کو ہم اپنے پروگرام کے مطابق ظہران گئے اور وہاں بھی ۱۱ بجے سے ۲½ بجے تک سوالات و جوابات کا سلسلہ رہا۔ اس دن جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز ہم نے کوارٹروں ہی کی مسجد

میں پڑھی۔ خطیب و امام ایک نجدی عالم تھے۔ خطبہ تو انہوں نے غنیمت دیا لیکن نماز میں قرآن مجید کی قرأت صحیح نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نجد میں قرآن مجید کی صحیح قرأت سکھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے اور یہ اعتماد کر لیا گیا ہے کہ جب یہ لوگ عرب ہیں تو قرآن آپ سے آپ صحیح پڑھیں گے۔

جمعہ کے بعد کھانے اور آرام کرنے کا وقفہ رہا اور ½۴ سے ¾۵ تک پھر سوالات و جوابات کا سلسلہ رہا۔ اس دن کی یہ ساری گفتگو ٹیپ ریکارڈ کی گئی۔

کمپنی کی ملازمت کے سلسلے میں جو پاکستانی حضرات یہاں مقیم ہیں، ان میں اکثریت تو ایسے لوگوں کی ہے جنہیں کمانے اور کھانے کے سوا کوئی دوسری فکر نہیں ہے۔ تہائی حصہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو دینی حس رکھتے ہیں اور فکری لحاظ سے کسی نہ کسی مکتب فکر سے وابستہ ہیں یا اس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ ایک صاحب قادیانی بھی ہیں، مگر وہ اپنے آپ کو قادیانی ظاہر نہیں کرتے اور نہ ان کی یہاں کوئی سرگرمیاں ہیں۔ ایک صاحب احراری بھی ہیں، مگر عملاً وہ بھی خاموش ہیں۔ بارہ کے قریب تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ یہ لوگ یہاں بھی مختلف بستیوں میں تبلیغی دوروں کے لیے نکلتے اور لوگوں کو نماز کی تلقین کرنے اور ان کا کلمہ صحیح کراتے رہتے ہیں۔

چند لوگ ایسے بھی ہیں جو پرویز صاحب سے متاثر ہیں اور یہاں اچھی خاصی سرگرمی سے ان کے خیالات کی اشاعت کر رہے ہیں۔ مولانا سے بڑی عقیدت سے ملتے رہے لیکن ان سے طرح طرح کے اُلٹے سیدھے سوالات کر کے انہیں اُلجھانے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ ۱۳ر نومبر کو انہوں نے مولانا کو اپنے ہاں آنے اور چند سوالات (جو انہوں نے پہلے سے مولانا کو لکھ کر دے دیئے تھے) کا جواب دینے کی دعوت دی۔ انہوں نے یہ سوالات بڑے سوچ بچار کے بعد مرتب کیے تھے اور عام لوگوں میں یہ کہتے پھرتے تھے کہ آج دیکھنا ہے مودودی صاحب کتنے پانیوں میں ہیں۔ ہم عشا کے بعد ان کے ہاں گئے۔ وہاں دو ڈھائی سو آدمی جمع تھے اور لاؤڈ سپیکر اور تمام سوالات و جوابات کو ٹیپ ریکارڈ کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ مولانا نے ان تمام سوالات کا اور ان کے بعد جو بہت سے دوسرے سوالات کیے گئے، ان کا بھی بڑی تفصیل سے جواب دیا، جس کا تمام

حاضرین پر بہت ہی اچھا اثر ہوا۔ اگرچہ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ مولانا کے جوابات سے خود ان حضرات کی بھی اصلاح ہو گئی ہوگی، لیکن یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ جو لوگ ابھی دامِ پرویزی میں نہیں پھنسے ہیں وہ آئندہ کے لیے محفوظ ہو گئے ہوں گے۔

دَمّام اگلے دن ۱۳ اکتوبر کو ہم لوگ عصر تک اپنی قیام گاہ ہی پر رہے اور مولانا آئندہ سفر کی تیاری کے سلسلے میں بعض کتابوں کا مطالعہ فرماتے رہے۔ مغرب کے قریب ہم چودھری محمد اکبر صاحب (سیالکوٹ) کے صاحبزادے انور پاشا صاحب کے ہاں دمّام گئے، جو کاروبار کے سلسلے میں ان دنوں وہاں مقیم ہیں۔ انہوں نے مغرب کے بعد ہمیں اپنے ہاں کھانے پر بلایا تھا۔ اس بہانے سے ہمیں دَمّام دیکھنے کا بھی موقع مل گیا۔ دَمّام سعودی عرب کے منطقہ شرقیہ (جس میں خبر، راس تنورہ، دمام، بُقیق، ہفوف اور احساء کے اضلاع شامل ہیں) کا صدر مقام ہے اور یہیں اس منطقہ کا گورنر رہتا ہے۔ پہلے اس منطقہ کا صدر مقام ہفوف تھا، لیکن جب سے تیل دریافت ہوا ہے اور آرامکو نے ظہران میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کیا ہے، دَمّام کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے علاوہ ازیں دمام، جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، سعودی عرب کے مشرقی ساحل کی سب سے بڑی بندرگاہ اور تھوک مال کی منڈی بھی ہے، اور یہاں سے ظہران، بُقیق اور ہفوف وغیرہ کے راستے ریل اور سڑک دونوں ریاض تک جاتی ہیں۔ انور پاشا صاحب کے ہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ جو سب کے سب سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ سیالکوٹی لوگوں کی خبر، ظہران، راس تنورہ، بُقیق اور ریاض وغیرہ ہر مقام پر اچھی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ ہم جہاں بھی گئے ہمیں سیالکوٹ کا کوئی نہ کوئی آدمی ضرور ملا، یہاں تک کہ ان کے متعلق کمپنی کے ملازمین میں ایک لطیفہ یہ مشہور ہے کہ چند لوگ راکٹ کے ذریعے چاند پر پہنچے تو انہیں وہاں چند آدمی ٹہلتے ہوئے ملے۔ انہوں نے ان سے دریافت کیا کہ تم لوگ کہاں کے رہنے والے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ سیالکوٹ کے۔ غالباً سیالکوٹ کے لوگ جو اس کثرت سے ملک سے باہر نکلے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ تقسیم کے بعد اس شہر کی بہت سی صنعتیں تباہ ہو گئی ہیں اور معاشی طور پر یہ لوگ پریشان ہیں۔

عشا کے بعد ہم دمام ہی کے ایک مقامی باشندے شیخ جاسم کے ہاں گئے، جو ایک دفعہ پہلے مولانا کے پاس آئے تھے اور ان سے اپنے ہاں آنے کا وعدہ لے گئے تھے۔ وہاں پہنچے تو چند عرب نوجوان ایک کمرے میں جمع تھے اور انہوں نے مولانا سے اس زمانے میں دعوتِ اسلامی کے لیے کام کرنے کے متعلق ہدایات طلب کیں۔ یہ سلسلہ رات کے ½ ۱۱ بجے تک جاری رہا اور اس کے بعد ہم خُبَر واپس آ گئے۔

گورنر سے ملاقات اور شاہی مہمانی ان چار دنوں (۱۱ تا ۱۴ نومبر) میں ہم اس قدر مصروف رہے کہ ہمیں اپنے آئندہ سفر کے لیے تیاری کرنے کی بالکل فرصت نہ مل سکی۔ ۱۵ نومبر کو مولانا نے کسی ملاقات کے لیے باہر جانے سے صاف انکار کر دیا اور آئندہ سفر کے سلسلے میں تیاری شروع کی۔ راؤ اختر صاحب کو دو کاموں کے لیے روانہ کیا۔ ایک تو کراچی سے روانہ ہوتے ہوتے سعودی سفیر نے ہمیں جو خطوط دیئے تھے، ان میں سے ایک میں ہمیں تمام رسوم (ٹیکسوں) سے معاف کیا گیا تھا اس خط کا مجھے اور راؤ صاحب کو علم نہ تھا، اس لیے ہم نے ہوائی اڈہ اور بندرگاہ پر سعودی عرب میں داخلہ کے پچاس پچاس ریال ادا کر دیئے تھے۔ مولانا نے راؤ صاحب کو یہ خط دیا کہ وہ ہوائی اڈہ اور بندرگاہ پر جا کر سو ریال واپس لے آئیں۔ اسی طرح دمام میں چودھری غلام محمد صاحب کا پاسپورٹ بھی روک لیا گیا تھا، اسے بھی واپس لینا تھا۔ دوسرے مشورہ ہوا کہ خُبَر سے ریاض روانہ ہونے سے پہلے منطقہ شرقیہ کے گورنر امیر سعود بن جلوی (جو شاہ سعود کے ماموں لگتے ہیں)، کے ہاں ایک کرٹسی کال (زیارۃ المجاملہ) ضرور کرنی چاہیے۔ اس لیے راؤ اختر صاحب کو دارالامارۃ (قصرالامیر) بھی بھیجا گیا کہ ملاقات کے لیے وقت مقرر کر آئیں۔ لیکن جب راؤ صاحب وہاں پہنچے تو امیر کے بڑے صاحبزادے امیر عبدالعزیز نے ان سے کہا کہ ہمیں ابھی تک مولانا کے خُبَر پہنچنے کی اطلاع نہیں ہوئی تھی، ورنہ انہیں ایئرپورٹ ہوٹل میں ٹھہراتے، کیونکہ وہ شاہی مہمان ہیں اور انہیں ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچانے کی ہمیں وزیر اعظم کی طرف سے ہدایات موصول ہو چکی ہیں۔ امیر عبدالعزیز نے راؤ صاحب سے یہ گلہ بھی کیا کہ آپ نے اب تک مولانا کو اپنے

ہاں کیوں ٹھہرائے رکھا؟ الغرض بارہ بجے کے قریب راؤ اختر صاحب کے ساتھ امیر کا ایک آدمی آیا اور اس نے امیر کی طرف سے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے مولانا سے اصرار کیا کہ جلد از جلد ایرپورٹ ہوٹل میں منتقل ہو جائیں۔ ہم نے سامان باندھنے کے لیے ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی مہلت طلب کی اور پھر دو بجے کے قریب ہوٹل پہنچ گئے۔ ایرپورٹ کا یہ ہوٹل بہت ہی شاندار اور بالکل نئے طرز کا بنا ہوا ہے اور اس میں زیادہ تر حکومت ہی کے مہمان ٹھہرتے ہیں۔ غالباً ظہران، خُبَر اور دَمام میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا ہوٹل ہے بھی نہیں۔

شام کو ۴½ بجے ہم لوگ امیر سعود بن جلوِی کی ملاقات کے لیے دارالامارہ گئے۔ ایک نہایت شاندار کمرے میں امیر سعود کی نشست تھی اور پورا شاہی دربار کا سا سماں تھا۔ ان کی صحت ان دنوں خراب تھی، اس لیے وہ مولانا سے مصافحہ اور سلام کے بعد خود گفتگو نہ کر سکے۔ درمیان میں سیکرٹری تھا اور اسی کے ذریعے گفتگو ہوتی رہی۔ مولانا نے انہیں اپنی چار کتابیں (مبادیٔ الاسلام، الحجاب، الربا اور نظریۃ الاسلام الخلقیہ) پیش کیں اور کراچی سے لایا ہوا سوہن حلوہ کا ایک ڈبہ بھی دیا۔ مغرب کے بعد انہوں نے ہم لوگوں کو کھانے پر بلایا۔ مغرب کے بعد جب ہم الامارۃ پہنچے، تو امیر خود تو موجود نہ تھے، انہوں نے کھانے میں شرکت سے اپنی خرابیٔ صحت کی بنا پر معذرت کر دی تھی۔ ان کے بڑے صاحبزادے امیر عبدالعزیز ان کی نیابت کے لیے موجود تھے اور انہی نے ہمارے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے پر ہمارے علاوہ بہت سے شیوخ موجود تھے۔ وزیر اعظم قَطَر کا بڑا لڑکا اور ایک امریکن بھی شریک تھے۔ کھانا بالکل مغربی طرز کا تھا اور مغربی طرز ہی پر چھری اور کانٹے سے کھایا گیا۔ شاہ سعود اور دوسرے امراء کی جو دعوتیں صرف عربوں کے لیے ہوتی ہیں، وہ غالباً اب بھی عربی طرز ہی پر ہوتی ہیں۔ اس دعوت پر میرے اور راؤ اختر صاحب کے ساتھ ایک عجیب لطیفہ پیش آیا، جو شاید دوسروں کے لیے تو لطیفہ ہو، لیکن ہمارے اپنے لیے ندامت کا باعث ہے۔ اور وہ یہ کہ سروس کرنے والے خادم باری باری تمام مہمانوں کے سامنے کھانے کی ڈش پیش کر رہے تھے۔ دوسری مرتبہ وہ مرغی کے گوشت کی ڈش لائے۔ مولانا سمجھ گئے اور انہوں نے یہ گوشت نہ اٹھایا، لیکن میں اور راؤ صاحب سمجھ نہ سکے اور ہم نے وہ گوشت لے کر

کھالیا۔ سروس کرنے والے خادم ہندوستانی تھے۔ انہوں نے ہمیں بعد میں بتایا کہ یہ ڈبہ کی مرغی تھی ہمیں سخت افسوس ہوا۔ یاد نہیں کہ چودھری صاحب بھی محفوظ رہے یا وہ بھی ملوث ہو گئے۔

یہاں دمام میں گجرات (پاکستان) کے ایک ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں، جن کا نام عبدالمجید حسن ہے اور وہ سولہ سال سے یہیں مقیم ہیں۔ امیر سعود بن جلوی کے ذاتی ڈاکٹر ہیں اور آرامکو میں بھی آنکھوں کے ڈاکٹر ہیں۔ اپنی پرائیویٹ پریکٹس الگ کرتے ہیں۔ انہوں نے مولانا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی، کیونکہ اسلام کے متعلق ان کے ذہن میں چند اشکالات تھے اور وہ ان کا حل چاہتے تھے۔ چودھری صاحب کو بھی ان سے اپنے لیے دوا لینی تھی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم ان کے ہاں گئے۔ علیک سلیک اور رسمی گفتگو کے بعد انہوں نے مولانا سے چائے پینے کی درخواست کی۔ چائے کے لیے ہم ان کے مکان کی سب سے اوپر کی منزل میں گئے، جہاں ان کی اپنے بال بچوں کے ساتھ رہائش ہے۔ اس وقت ان کے بچے ٹیلیویژن دیکھ رہے تھے۔ ٹیلیویژن پر اس وقت ظہران ایرپورٹ کا پروگرام جاری تھا اور فٹ بال کا میچ ہو رہا تھا۔ جب تک چائے تیار نہیں ہوئی، ہم بھی ٹیلیویژن پر یہ میچ دیکھتے رہے۔ یہ میرے لیے ٹیلیویژن دیکھنے کا پہلا موقع تھا۔ شکر ہے اس وقت صرف فٹ بال کا میچ ہو رہا تھا، کوئی دوسرا پروگرام نہ تھا۔ یہاں ظہران میں ٹیلیویژن کے دو مرکز ہیں۔ ایک آرامکو کے ہیڈ کوارٹر میں اور دوسرا ایرپورٹ پر۔ ایرپورٹ کے پروگرام صرف انگریزی میں ہوتے ہیں اور آرامکو کے انگریزی اور عربی دونوں میں۔ یہ پروگرام صرف علمی اور معلوماتی ہی نہیں ہوتے، بلکہ ان میں ہر طرح کے پروگرام شامل ہوتے ہیں۔ عرب نوجوانوں پر، جن کے پاس پیسہ بھی وافر ہے اور وقت بھی فالتو ہے اور ان پر اخلاقی لحاظ سے بھی کوئی پابندی نہیں ہے، ان پروگراموں کا جو اثر ہوتا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ الامر بالمعروف والنہی عن المنکر والے سینما پر تو پابندی لگا سکتے ہیں اور واقعی انہوں نے یہ پابندی لگائی ہوئی ہے۔ چنانچہ کمپنی کے پورے علاقہ میں کوئی سینما نہیں ہے۔ لیکن ٹیلیویژن سے عرب نوجوانوں میں جو مغربی تہذیب کی تقلید کے بُرے اثرات پھیلتے ہیں، ان کی روک تھام کیسے ہو سکتی ہے؟

چائے کے بعد ہم لوگ ہوٹل آتے اور وہیں مولانا کے دیئے ہوتے وقت کے مطابق ۹ بجے

ڈاکٹر عبدالمجید حسن صاحب پہنچ گئے۔ انہوں نے مولانا سے دعا کے فلسفے کے متعلق سوالات کیے۔ مولانا نے ان کے سوالات کا تفصیل سے جواب دیا، جس سے ان کے ذہن کی الجھن پوری طرح تو نہیں، لیکن بڑی حد تک دُور ہو گئی۔ ایک بجے رات تک بہت سے پاکستانی نوجوان مولانا کے پاس بیٹھے رہے اور مختلف علمی اور دعوتی موضوعات پر سوالات کرتے رہے۔ ڈیڑھ بجے کے قریب ہم لوگ سو سکے۔

آرام کو کی لائبریری ۱۶ر نومبر کو ہمارا پروگرام ایک تو بازار سے ضرورت کی چیزیں خریدنے کا تھا اور دوسرے آرامکو کی لائبریری دیکھنے کا۔ لائبریری پیشگی اجازت کے بغیر نہیں دیکھی جا سکتی، اس لیے راؤ اختر صاحب کو امیر کے سکرٹری کے پاس بھیجا گیا تاکہ ہمارے لیے لائبریری دیکھنے کا انتظام کرا دیں۔ راؤ صاحب واپس آئے اور انہوں نے بتایا کہ دس بجے امیر کا ایک آدمی آئے گا اور ہمیں لائبریری لے جائے گا۔ ۹ بجے ہم خُبر گئے اور وہاں دیر تک بازار میں اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتے رہے۔ ۱۰½ بجے مولانا راؤ اختر صاحب کے ساتھ لائبریری چلے گئے اور میں اور چودھری صاحب ساڑھے بارہ بجے تک بازار ہی میں رہے۔ خُبر کے بازاروں میں گھومنے سے ہمیں اندازہ ہوا کہ یہاں چیزیں بہت گراں ہیں، یعنی بحرین سے کم از کم دگنی۔ دکانداروں کی بکری خوب ہوتی ہے، کیونکہ کمپنی کے جو بھی امریکن، عرب یا دوسرے ملازمین ہیں، وہ سب یہیں سے اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتے ہیں اور پیسہ وافر ہونے کی وجہ سے گرانی کی کم ہی پروا کرتے ہیں۔ خُبر کے بازاروں میں ہمیں بہت ہی کم بے پردہ عورتیں گھومتی نظر آئیں۔ بے پردہ عورتیں یا تو امریکن تھیں یا کچھ شامی، فلسطینی، مصری اور لبنانی۔ یہ سب امر بالمعروف والنہی عن المنکر کے ڈنڈے کا اثر ہے کہ کوئی مقامی عورت پردہ کے بغیر بازار میں نہیں نکل سکتی۔ امریکنوں پر تو خیر کوئی پابندی لگائی نہیں جا سکتی، البتہ پہلے شامی، فلسطینی، مصری اور لبنانی عورتوں پر بھی پردہ کی پابندی تھی۔ لیکن اب معلوم نہیں کیوں انہیں ڈھیل دے دی گئی ہے۔ (حال میں اخبارات سے معلوم ہوا کہ اب بے پردہ عورتوں کا نکلنا ممنوع ہو گیا ہے۔)

ظہر کے بعد ہم بھی مولانا کے ساتھ آرامکو کی لائبریری پہنچ گئے۔ آرامکو کی یہ ریسرچ لائبریری بہت ہی شاندار ہے۔ عرب اور مسلمان ملکوں کے متعلق جس نے جس زبان میں بھی جو کتاب لکھی ہے

وہ یہاں موجود ہے۔ خصوصاً جزیرہ عرب کے متعلق تو امریکنوں نے اتنی تحقیقات کی ہیں اور اس کے ایسے ایسے تفصیلی نقشے تیار کیے ہیں کہ ان کی مدد سے انہیں جزیرہ عرب کے متعلق جو معلومات حاصل ہیں وہ یقیناً خود عربوں کو بھی حاصل نہیں ہونگی۔ علاوہ ازیں ادب، تفسیر، حدیث، فقہ اور دوسرے اسلامی موضوعات کی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ بھی اس لائبریری میں موجود ہے۔ مولانا دو گھنٹے تک لائبریری کی فہرست دیکھ کر اپنے مقصد کی کتابوں کے نام نوٹ کرتے رہے اور اس کے بعد ہم لوگ ہوٹل واپس آگئے۔

آرامکو کی یہ لائبریری جس عمارت میں واقع ہے، وہ آرامکو کا مرکزی دفتر ہے اور کئی منزلہ ہے۔ اس کی تعمیر فولاد سے ایسے طرز پہ کی گئی ہے کہ اس پر آگ یا زلزلہ کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ سنا ہے کہ پوری لاگت جو اس پر آئی ہے وہ ۵ ء ملین ڈالر یعنی تقریباً ۲ء۳ کروڑ روپے ہے۔ امریکن بظاہر سعودی حکومت اور سعودی ملازمین کی بڑی خاطر مدارات کرتا ہے اور موقع بے موقع ان کی نرم گرم بھی سہتا ہے، لیکن بالکل اس بنیے کی طرح جو اپنے گاہک یا قرضدار کی بڑی آؤ بھگت کرتا ہے لیکن اپنے مفاد سے نہیں چوکتا۔ امریکنوں نے اپنے پنجے سرزمین عرب میں کچھ اس زور سے گاڑے ہیں کہ وہ کبھی خود نکل جائیں تو نکل جائیں، نکالے سے نہیں نکل سکتے۔ عرب نوجوان جب ایک طرف آرامکو کے اس شاندار وسیع اور کسے ہوئے نظام کی طرف دیکھتے ہیں اور دوسری طرف اپنی حکومت کے سروسامان اور نظام کو، تو ان کے دلوں میں امریکنوں کا رعب اور ان کی تہذیب کی برتری کا احساس شعوری اور غیر شعوری طور پر پیدا ہو جاتا ہے۔

سفرِ ریاض ۱۷ ارنومبر کو ہمارا پروگرام ریاض روانہ ہو جانے کا تھا۔ ہم لوگ صبح جلدی اٹھے اور نماز کے بعد اپنا سامان باندھنے لگے۔ گاڑی کا وقت ۸ بجے کا تھا، لیکن ابھی ہم سامان باندھ ہی رہے تھے کہ ½۷ بجے کے قریب اسماعیل خاں صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ ہفوف کے قریب ریل کی پٹری خراب ہو گئی ہے، اس لیے گاڑی ۸ بجے کے بجائے ۱۰ بجے روانہ ہو گی۔ ۱۰ بجے پھر ٹیلیفون آیا کہ ابھی پٹری ٹھیک نہیں ہوئی اس لیے گاڑی ۱۲ بجے روانہ ہو گی۔ ۱۲ بجے اطلاع آئی کہ ابھی پٹری

خراب ہے۔ گاڑی ۳ بجے روانہ ہوگی۔ ۳ بجے آخری اطلاع آئی کہ آج گاڑی روانہ ہی نہ ہوگی۔ ہم نے محض انتظار میں شام تک ہوٹل ہی میں وقت گزارا۔ مغرب سے پہلے ہم ظہران ریلوے سٹیشن گئے۔ وہاں اسٹیشن والوں نے بتایا کہ کل گاڑی کے روانہ ہونے کا امکان ہے، اس لیے آپ لوگ صبح ۷ بجے پتہ کریں۔

یہاں کی گاڑیوں کا نظم بھی خوب ہے۔ دمام سے ریاض تک صرف دو گاڑیاں جاتی ہیں۔ ایک ایرکنڈیشنڈ، جس کے تمام ڈبے فسٹ کلاس ہی کے ہوتے ہیں اور ۸ گھنٹے میں ریاض پہنچتی ہے۔ (دمام اور ریاض کے درمیان ۲۷۰ میل کا فاصلہ ہے)۔ یہ ہفتہ میں صرف تین دن یعنی ہفتہ، منگل اور جمعرات کو چلتی ہے۔ دوسری پسنجر جو ایرکنڈیشنڈ نہیں ہوتی اور ۱۴ گھنٹے میں ریاض پہنچتی ہے یہ بھی ہفتہ میں صرف تین یا چار دن چلتی ہے۔ گاڑیوں کے روانہ ہونے کے دن اور اوقات اگرچہ مقرر ہیں، لیکن کسی گاڑی کے متعلق یہ قطعی نہیں ہے کہ وہ اپنے مقرر دن اور وقت پر روانہ ہو ہی جائے گی۔ ہر چیز قابلِ تغیر ہے۔ کچھ ایسا ہی حال یہاں کے ہوائی جہازوں کا بھی ہے، اس لیے ہمارے پاکستانی احباب نے ان کا نام "ممکن ایرلائنز" اور "ممکن ریلویز" رکھا ہوا ہے اور سعودی باشندے بھی بعض اوقات انہیں ان ہی ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ گاڑی یا ہوائی جہاز کے لیٹ ہونے کی صورت میں جب ان کے ذمہ دار حضرات سے دریافت کیا جاتے کہ گاڑی یا ہوائی جہاز کی روانگی کب ہوگی تو وہ کہیں گے "یمکن بعد نصف ساعۃ، یمکن بعد ربع ساعۃ، یمکن بعد ساعۃ"، لیکن یہ ساعۃ ہے کہ اس کا ربع اور نصف بھی بعض اوقات کئی کئی گھنٹے لمبا ہو جاتا ہے۔ گذشتہ سفر میں اس "یمکن" نے ہمیں دمشق کے ہوائی اڈہ پر چھ گھنٹے تک روکے رکھا۔ نہ ہم ہوائی اڈہ سے شہر جا سکتے تھے اور نہ ہوائی جہاز کے روانہ ہونے کی نوبت آتی تھی۔

۱۸ نومبر کی صبح ہم اٹھے، تو معلوم ہوا کہ گاڑی کے روانہ ہونے کا آج بھی امکان نہیں ہے اس لیے ہم آرام سے اپنا کام کرتے رہے، لیکن ۹½ بجے کے قریب یکایک اطلاع آئی کہ گاڑی آج ۱۱ بجے ظہران سٹیشن سے روانہ ہوگی۔ ۱۰½ بجے ہم سٹیشن پہنچ گئے، لیکن گاڑی ۱۲ بجے سے پہلے روانہ نہ ہوسکی

۱/۲ ۱۱ بجے کے قریب امیر سعود بن جلوی کے سیکرٹری صاحب آئے اور انہوں نے ہمارے لیے تین سیٹیں ریزرو کرا دیں اور ہم سے کہا کہ یہاں سے ریاض اطلاع کر دی گئی ہے۔ آپ لوگ ریاض پہنچ کر سٹیشن سے سیدھے دار الضیافۃ الملکیہ (شاہی مہمان خانہ) چلے جائیں۔" گاڑی چار ڈبوں پر مشتمل اور ہمارے ہاں کی ریل کاروں سے مشابہ تھی اور پوری کی پوری ایئر کنڈیشنڈ تھی صحراء میں ایئر کنڈیشنڈ ڈبے بڑی ہی نعمت ہیں۔ ورنہ یہاں گرد اتنی اڑتی ہے کہ تھوڑی ہی دیر میں آدمی کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ ایک بجے کے قریب ہم بقیق پہنچے۔ اسٹیشن پر ۲۰ کے قریب پاکستانی احباب مولانا کو الوداعی سلام کہنے کے لیے موجود تھے۔ ۲ بجے کے قریب ہم ہفوف پہنچے، جو کبھی اس منطقہ شرقیہ کا صدر مقام تھا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہمیں یہ بہت بڑا اور نہایت ہی خوبصورت اور شاداب شہر نظر آرہا تھا۔ کئی میل تک نخلستان کا سلسلہ تھا۔ ۵ بجے تک ہم ہفوف ہی پر رکے رہے، کیونکہ آگے ریل کی پٹری خراب تھی اور اس کی مرمت ہو رہی تھی۔ ۵ بجے ہفوف سے روانہ ہوئے، لیکن ۶ بجے اس مقام پر جا کر رک گئے جہاں پٹری کی مرمت ہو رہی تھی۔ مرمت بڑے زور شور سے ہو رہی تھی، کیونکہ اگلے روز ۱۹ اکتوبر کو شاہ سعود دمام جانے کے لیے یہاں سے گزرنے والے تھے مختلف سٹیشنوں پر ان کے استقبال کی تیاریاں بھی ہو رہی تھیں۔ اگر شاہ سعود کو یہ سفر نہ کرنا ہوتا تو معلوم نہیں مرمت میں کتنے دن لگ جاتے اور ہمیں کتنے دن اور خبر میں رکے رہنا پڑتا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اس مقام سے گاڑی چل دی۔ اس کے بعد معلوم نہیں کون کون سٹیشن آئے۔ ہمیں صرف حرض اور خرج کا علم ہو سکا، لیکن اندھیرے میں انہیں بھی نہ دیکھ سکے۔ رات کے ایک بجے جب ریاض پہنچے تو بھوک نے سخت پریشان کر رکھا تھا چلتے وقت ہم نے لوگوں سے دریافت کیا تھا کہ کیا گاڑی میں کھانا مل جاتا ہے؟ انہوں نے ہاں میں جواب دیا تھا۔ اس لیے ہم نے اپنے ساتھ کھانے کے لیے کوئی چیز نہ لی تھی، لیکن گاڑی میں پہنچ کر دیکھا کہ صرف ایک چھوٹی سی دکان ہے جس پر صرف چائے اور توس مل سکتے ہیں۔ چائے بھی دکاندار نے ایک تھرماس میں ڈال رکھی تھی۔ چند پیالیاں تھیں فوراً ختم ہو گئیں۔ دوپہر کو جب ہمیں بھوک لگی تو دو دو توس لیکر کھا لیے، لیکن شام کو اور رات کو وہ بھی نہ مل سکے منگمری اسٹیشن سے گزرتے وقت شیخ محمد امین صاحب نے مولانا کی خدمت میں اپنی فیکٹری کے بسکٹوں کے کچھ ڈبے پیش کیے تھے یہ بسکٹ یہاں کام آئے انہیں کھا کر پانی پی لیا۔ لیکن ان سے بھوک تو ختم نہ ہو سکتی تھی۔ بہر حال صحیح سلامت پہنچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور سٹیشن سے دار الضیافہ پہنچنے کی فکر کرنے لگے۔